جادۂ نو

مکتبۂ دانش مزنگ لاہور

احسان دانش

نوائے کارگر

احسان وہی شاعری کرتا ہے جسکی ملک اور قوم کو ضرورت ہے اُسکے کلام کی داد تھرتھراتے ہونٹوں، برستی آنکھوں اور بھرآئی ہوئی آوازوں سے ملتی ہے۔

احسان فطری شاعر ہے اور الفاظ میں مصوری کرتا ہے۔ اسکے سامنے فطرت اپنی نازک سے نازک تفصیلات کے ساتھ بے نقاب نظر آتی ہے۔

اِس کتاب کی اکثر دردانگیز نظموں اور خصوصاً انسانی معاشرت کے بیمار پہلوؤں کی منظر کشی میں احسان اِسقدر بلند ہوگیا ہے کہ اِسکی ہر نظم شاعرانہ قدرت کا شاہکار معلوم ہوتی ہے۔

تغزل میں بھی وہ ایک مخصوص انداز کا مالک ہے! ور اکثر جگہ وہ وہ نوک پلک دکھا جاتا ہے کہ ایک ایک شعر ایک ایک نظم کا حکم رکھتا ہے۔

قیمت عا مجلّد عہ

صفحات ۲۶۸

مکتبہ دانش مزنگ لاہور

جادۂ نو

احسان دانش

انتساب

ڈاکٹر سیّد نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لاء

کے نام!

احسان دانش

انتباہ

کوئی فرد یا ادارہ نقل و اقتباس اور ترجمہ و تشریح کا مجاز نہیں ہے۔ جملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ ہیں!

احسان دانش

پیمانۂ ادب

شاعری اور اس کے اجزاء و عناصر کی تشریح مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن معلوم ہوتی ہے۔ ہر قلم کی زبان، ہر دماغ کی کاوش، ہر تخیل کی جست اور ہر فکر کی سنجیدگی اس کے اسرار کو نہیں پا سکتی۔ آج تک اس موضوع پر نہ جانے کتنی کتابیں لکھی گئیں اور کتنے مقالات سپرد قلم ہوئے گراں جواہر ریزوں اور لعل پاروں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو مکمل کہلانے کا مستحق ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مفکرین کے نظریوں کی شکست اور مدبروں کے اقوال کی نرمی پر ہمیں کانپ کر قلم رکھ دینا چاہیے بلکہ جہاں تک ہو سکے تحقیق و تدقیق سے کام لینا چاہیے ممکن ہے کہ زندگی کے برق رو لمحے کسی مفید کام میں آ جائیں۔ اور اس منزل کے رہروؤں کے لئے چراغِ ہدایت ثابت ہوں کیونکہ اس میں سے کچھ حصص ایسے بھی ہیں جو تجربہ سے احاطہ بیان اور پنجۂ نطق کی گرفت میں آ سکتے ہیں۔

غیر تربیت یافتہ طبقہ کی اونگھتی ہوئی ذہنیتوں اور سوئے ہوئے دماغوں میں شاعری وقت گذارنے کا ایک ذریعہ اور ادراک و اوہام کی عیاشی کے لئے ایک دلفریب مشغلہ ہے۔ جس کی قدر و منزلت ان کے خیال سے اتنی ہی ہے جتنی کہ ان کی ضرورت اور اہمیت اجازت دیتی ہے لیکن

اگر یہ صرف تفننِ طبع کے علاوہ اور کچھ اپنے دامن میں نہیں رکھتی تو اس کے قواعد و ضوابط کی ترتیب میں قیمتی زندگی کے لمحات کی بھینٹ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کو آئندہ ترقی دینے سنگارنے یا جوان کرنے میں دل و دماغ کی مشینری کے بیش قیمت پرزوں کے جنبش دینے کو خونِ زندگی کا مترادف نہیں کہیں گے تو اور کیا نام دیں گے؟ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مشاہدے میں آتا ہے کہ تربیت یافتہ، روشن خیال اور بیدار دماغ انجمنیں اور ادارے شاعری کو حواس ظاہری و باطنی کی مسرت کا اثر آفریں گردانتے ہیں اگرچہ حواس ظاہری و باطنی بھی شاعرانہ قوت و لطافت سے بلند نہیں کیونکہ احساس کا تعلق روح سے ہے اور روح وہ تنہا شے ہے۔ جو تمام معروف قوتوں پر حاوی ہے۔ اور شاعری اُس کی آواز۔ حواسِ ظاہری و باطنی تو صرف وسیلہ ترسیل اور آلہ کار بن کر ہر نحیف سے نحیف آواز، خفیف سے خفیف جنبش اور ہلکی سے ہلکی مہک کو روح پر منعکس کرتے ہیں جہاں وہ موہوم اور عارضی عکس تھرتھری یا مس، بالغ اور وسیع ہو کر اس درجے تک پہنچ جاتا ہے کہ قوتِ خیال کے رگ و ریشے میں ایک بیتابی ساری ہو جاتی ہے جو تخیل سے تحلیل ہو کر نطق اور نطق کی صنم ساز کارگاہوں سے جامۂ الفاظ پہن کر تحریر کی رنگا رنگ مجلسوں میں نظر آتی ہے مگر صحیح شاعری کا مرکز اس سے کہیں بلند ہے جو ہے تو اسی عمل کے تحت مگر تابانی، پائیداری اور تاثیر میں فرق ہے۔

شاعر کی روح پر حقیر سے حقیر سخت گیری اور ادنیٰ سے ادنیٰ مسرت کا اثر طوفانی صورت میں عکس افگن ہوتا ہے اور روح کے الاپے ہوئے سربستہ نغمے الفاظی صورت میں سامع نواز ہو کر سامعین کی روح پر سیلابی مگر ساحری طرحداریوں سے پرتو ریز ہوتے ہیں۔ جو ہر بیدار اور

بالغ روح کے لئے انبساط و لطافت کا سامان ہیں۔

شاعری روح کی ایک تاثر خیز چیخ ہوتی ہے اور روح یزدانی قوتوں کا ایک حصّہ۔ اس لئے یہ بھی اپنے اصل کی طرح تعمیر ارتقاء اور تخلیق کی عنصری قوّتوں کی حامل ہے اور جو لوگ اس کے خلاّقی اور نورانی پہلوؤں اور اس کی شاہراہوں کے ہر گھوم اور پگڈنڈیوں کے ہر موڑ سے واقف ہیں وہ اس کی خنک اور پرکیف تجلیوں سے نظر اٹھا کر خورشید کے جہاں افروز دامنوں پر بھی لپکنا گوارا نہیں کرتے۔

اساسی نقطۂ نظر سے شاعری کا مواد دو حصّوں میں منقسم ہو سکتا ہے۔ اول داخلی دوم خارجی

داخلی، ان غیر مرئی کیفیات کا نام ہے جن کا تعلّق تصوّر۔ تخیّل۔ احساس اور جذبات سے ہو اور دل و دماغ اس کے سفینہ راں رہیں۔

خارجی وہ ہے جو مادّیات کی بوقلمونی اور رنگارنگی سے اثر لے کر الفاظ میں اس انداز سے ڈھل جائے کہ اس کے اصواتی زیر و بم اس کے مرکز کی حقیقت کو بے نقاب کر دیں لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ داخلی اور خارجی شاعری میں اتنا بعد ہے کہ قاری یا سامع بآسانی خلا یا حدِ فاصل محسوس کر لے بلکہ یہ مرئی اور غیر مرئی کیفیات اس قدر ہم پیوند ہیں کہ ناظرین اور سامعین بیک کوشش اس فصل کو محسوس نہیں کر سکتے۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ شاعری بعض جگہ شدّت سے روحانی کیفیات کی حامل ہوتی ہے اور بعض جگہ مادّی دلچسپیوں سے لبالب۔

شاذو نادر ہی کوئی بالغ نظر ایسا ہوتا ہے جو داخلی اور خارجی کیفیات کو لفظی وجود میں لاکر بصد فخر و ناز شاعرانہ خلّاقی کا علم بلند کرنے میں حق بجانب ہوتا ہے ورنہ کہیں تو تخیّل طوطی و قمری اور غنچہ و گل تک محدود نظر آتی ہے اور کہیں سراسر توفیق تخیّل سے ماورئی نظارہ بندیاں۔ میرے خیال سے طرۂ امتیاز کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جو شاعری کے ان دونوں پہلوؤں پر استقامت اور استحکام سے حاوی ہو اور جہاں اُس کے متعلق سوال آئے۔ کہ یہ شاعر کس پہلو کے اظہار پر قادر ہے تو نقّادوں کے ہونٹ سِل کر رہ جائیں۔

اکثر شعرا کے اجسام احساس کی معرفت منظر سے تأثر لیکر روح تک پیغام رسانی کرتے ہیں اور اس کیفیت اور بیگانہ تأثر کو اگرچہ روح ہزار مشاطگی اور شائستگی سے الفاظ کی کارگاہ تک پہنچاتی ہے مگر اُس کی شاعری کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی جس کی روح اپنی اندرونی اور بیرونی کیفیات کو توضیح و اشاعت کے لئے شاعر کے دل و دماغ اور تخیّل و تصوّر کے سپرد کر دیتی ہے اور وہ شاعر انھیں اپنے ظرف و ضمیر کے مطابق اور ذاتی خراد پر قسم قسم کے پہلو تراش کے اس شان سے عالم وجود میں لاتا ہے کہ گذشتہ صنّاعوں کے قابلِ فخر کارنامے دُھندلے نظر آنے لگتے ہیں۔ اور غور و تفکّر کے کمیاب خوگروں کے سامنے یہ حقیقت واضح ہو کہ اُس یگانہ روزگار اور فریدِ محترم کے یہ پگھلے ہوئے روحانی احساسات و خیالات جب الفاظ و اوزان کے حسین سانچوں میں ڈھل کر خواص اختیار کر جاتے ہیں تو کوئی بھی روشن اور بیدار روح اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اس کی فکری اور تخیلی فضائیں قوّتِ تخلیق سے لبریز ہوتی ہیں اور بعض بعض اوقات وہ "شاعری جز دیست از پیغمبری" سے بڑھ کر فطرت، خدا اور شاعر

میں صرف اس قدر فرق محسوس کرتا ہے کہ فطرت کا تخیّل مادی اجسام اختیار کر لیتا ہے لیکن شاعر کا نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ الفاظ اس کی مخلوق ہوتی ہے اور الفاظ کے تاثرات و معانی ان کے اعمال ......موسیقی اس کی اس دنیا میں ہواؤں کی خدمت انجام دیتی ہے اور فلسفہ و تصوّف، کرشمہ اور اعجاز اس کے مختلف مقام ہیں۔

شاعر کی اس ادراک سے ماورئی دنیا کی لفظی آبادیوں میں حسن بھی ہوتا ہے اور کراہت بھی، سوز بھی پایا جاتا ہے اور ساز بھی، امارت کی بوقلمونیاں بھی ہیں اور ناداری کے جانسوز مناظر بھی۔ امیر اور حسین الفاظ وہ ہیں جو جامع، عام فہم، سلیس اور کھنک دار ہونے کے علاوہ ابدیت کے حامل ہوں اور کراہت و افلاس کا درجہ ان الفاظ کو دیا جاتا ہے جو جامعیت اور ذہن رسائی سے عاری، سماعت پر بار، آوارہ اور قریب المرگ ہیں۔

اس انبوہ میں سے الفاظ کا انتخاب شاعر کے ہوش و حواس اور اکتساب و اقتباس کے بس کی بات نہیں بلکہ جس درجے کا شاعر ہوتا ہے وہ اسی درجے کے الفاظ کی مخلوق اور گروہ پر حکومت کرتا ہے۔

مجھے جناب احسان دانش کی ذات سے غرض نہیں بلکہ اُن کی مطبوعات سے مطلب ہے اور ان کی شاعری کے متعلق ناظرین سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ تصنیف جو مصنف سمیت دل میں جگہ پا جائے کیا مصنّف کا روشن ترین کارنامہ نہیں؟

میرے خیال سے ایک وہ مصنّف جو اپنی تحریر کے اشارات اور نظریات کے مطابق زندگی

نہیں رکھتا اس کے نقوش عموماً بے جان ہوتے ہیں اور ایک شاعر جو اپنے کارناموں کے بیان کے مطابق زندہ ہو اس کا ادنیٰ سے ادنیٰ نقش بھی حیات جاوداں لے کر اترتا ہے کیونکہ شعر روح کی بے اختیار آواز ہوتی ہے اور شاعری نہیں بلکہ ہر تحریک میں محرک کی روح کارفرما ہوتی ہے۔

اگر مذاہبِ عالم پر ایک محققانہ نظر فلسفیانہ انداز سے ڈالی جائے تو ہر پیغمبر، مجدد۔ مجتہد اور ڈکٹیٹر کی روحانی تابشوں کے لحاظ سے مدارج قائم کیے جا سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس شعرا کے لباس اور شکلیں ان کے کارنامے نہیں بلکہ ان کے دواوین اور کلام کے مجموعے ان کی زندگی کے روزنامچے اور اخلاقیات کے پیمانے ہیں۔

جناب احسان دانش کو اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب انھیں نظم کہے عرصہ ہو جاتا ہے تو وہ یکایک خاموش ہو جاتے ہیں اور ایسے خاموش کہ گمان گزرتا ہے کہ انھیں کوئی فکر لاحق ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ جب وہ اس طرح خاموش ہو جاتے ہیں تو کچھ نہ کچھ کہتے بھی ضرور ہیں۔

یوں تو جناب احسان دانش چوبیس گھنٹوں میں مشکل سے دو تین گھنٹے سوتے ہونگے لیکن عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ انھیں نظم مکمل کر لینے کے بعد فوراً نیند آجاتی ہے۔ ایک دن میں نے دریافت کیا کہ آپ کو شعر کہہ کر نیند کیوں آجاتی ہے تو فرمایا کہ اور شاعروں کے متعلق تو مجھے معلوم نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ جب جذبۂ شعری طاری ہوتا ہے تو روح میں شدت اور التہاب پاتا ہوں اور جب شعر سپردِ قلم کر لیتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ میں، کاغذ پر، دائروں، لفظوں مرکزوں اور پیوندوں کے پیچھے میری روح بھی دبتی چلی آرہی ہے اور جب کوئی نظم پایۂ تکمیل کو

پہنچ جاتی ہے تو روح کو تسکین اور آرام طلب پاتا ہوں اور جب کسی کتاب کو خاموشی سے پڑھتا ہوں تو مصنف کی روح کو خود سے ہمکلام پاتا ہوں کیونکہ روح زندۂ جاوید ہے اور الفاظ کے حریری پردوں سے مصنّف کے دل و دماغ کی ترجمانی اُس کا کام ہے۔

شاعری کا جذبہ یوں تو فطرت ہی کی طرف سے عطا ہوتا ہے لیکن یہ نوخیزی سے جوانی تک دو صورتیں اختیار کرتا ہے، وہبی اور کسبی،

وہبی شاعر مخلص، راست گو، خود دار اور بے نیاز ہوتا ہے اور اس کی شاعری کی بنیاد آمد سے اُٹھتی ہے اور کسبی یا پیشہ ور شاعر خواہ کتنا ہی لکھا پڑھا کیوں نہ ہو، ضمیر فروش، خوشامدی کینہ پرور اور خود نما ہوتا ہے۔ اس کی شاعری آمد کی معطّر اور بہار آفریں وادیوں سے مُنہ پھیر کر آورد کے سنگ زاروں میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے اور اس کے کارنامے اسی کی طرح جوانی کے ساتھ جوان، ضعیفی کے ساتھ ضعیف اور مرنے کے ساتھ مر جاتے ہیں اس کے الفاظ گونگے اور اشعار بے رُوح کا خانہ نہیں ہوتا۔

مجھے جناب احسان دانش کی شاعری پر نثری قصیدہ لکھنا مقصود نہیں بلکہ ناظرین کو ایک صحیح اور فطری شاعر کے پرکھنے کی دعوت دینا مقصود ہے۔

میں اپنے معیار سخن فہمی سے صرف "جادۂ نو" ہی کو نہیں بلکہ جناب احسان دانش کی کتابیں "نوائے کارگر"۔ "چراغاں"۔ "آتش خاموش" کو مکرّر سکرّر پڑھ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جناب احسان دانش موجودہ دور کے انفرادی شعرا کی صف میں ہیں اور اس نو عمری

1054070
6010904

ہیں اُن کی یہ برق رَو ترقی حیران کُن ہے۔

اگر اِن جوان اعجاز کاریوں کے ساتھ ان کی عمر نے بھی وفا کی تو اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ بزمِ اُردو میں ان کے نام کتنے تصنیفی چراغ تاریخی محرابوں کی زینت ہونگے۔

سیّد مسیح الحسن بقا نقوی
یکے از انجمن تعمیرِ ادب - لاہور
یکم جنوری سنہ ۱۹۴۰ء

گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام احسان دانش پرنٹر و پبلشر چھپکر ذیشان بُک ڈپو مزنگ لاہور سے شائع ہوا

تعارف

از جناب سیّد راحت مولائی ایم۔ اے ایل ایل بی رکن ادارہ "تعمیر ادب"

کسی ماہر نفسیات کا قول ہے "ہم بجز اپنے قوائے حسیہ کے احساسات کے دنیا کی نسبت اور کچھ بھی نہیں جانتے"۔ برکلے کے فلسفہ تصوّریت کا اساسی اصول یہ ہی ہے کہ تمام انسانی معلومات کا سرچشمہ شہادت حواس پر مبنی ہے۔ محسوسات کو اکتسابات و اجتہادات کی دنیا میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ پروطاغورس سے لیکر ڈیکارٹ اور لاک تک اس مسئلے میں ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ پروطاغورس کا خیال ہے کہ تمام چیزوں کا معیار ذہنِ انسانی ہے۔ اپنے اس دعوی کی تشریح وہ اس طرح کرتا ہے کہ ایک ہی چیز کی نسبت مختلف لوگوں کے مختلف احساسات ہوتے ہیں اور اکثر ایک ہی شخص مختلف اوقات و حالات میں مختلف و متبائن کیفیات محسوس کرتا ہے۔ لہذا ذہن سے باہر محسوسات کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہنے پر آمادہ ہوں کہ یہ محسوسات اکثر ذہنی کیفیات کے ماتحت مختلف النوّع صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے لئے ایک ہی انسان کی وہ مختلف تحریرات

دیکھیے جو اس نے مختلف تاثرات یعنی غم، غصّہ، مسرّت اور وجد وکیف کے عالم میں لکھی ہوں۔ "میں سوچتا ہوں لہٰذا میں ہوں"۔ اس کا نام نفس، ذہن وغیرہ ہے۔ ہمارے ذہن میں کمالیت اور نامحدودیّت کے تصوّرات بیّن طور پر پائے جاتے ہیں۔ لاک تو اس حد تک کہہ گیا کہ موجودات خارجی محض صفات محسوسہ کا مجموعہ ہیں۔ ان صفات محسوسہ یا محسوسات کی دو قسمیں ہیں۔ حقیقی و غیر حقیقی۔ حقیقی سے مُراد وہ صِفات ہیں جو ذہن سے باہر خارج میں موجود ہیں اور حواس پر ان کا اسی طرح اِنعکاس ہوتا ہے جس طرح کسی شے کا آئینہ پر۔ صفات غیر حقیقی احساساتِ ذہنی ہوتے ہیں۔ ہم کو براہِ راست صرف اپنے ذہنی تصوّرات کا علم ہے۔ ہم کو اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ہم بہر عالم و بہر حالت ہولے کے اِرتعاشی سیلاب میں غرق رہتے ہیں۔ بلا لحاظ و قیدِ زمان و مکان، شب و روز غم و غصّہ۔ رنج و مسرّت روشنی، آواز و لمس کی لہریں ہر چہار طرف سے کمی یا زیادتی کے ساتھ ہماری جسمانی سطح کے اعصاب حسیّہ کے ناخفتہ سروں میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کرتی رہتی ہیں لیکن اِحساسی نقوش اور ان کا ادراک دو مختلف چیزیں ہیں۔ ادراک خود اختیاری ذہنی عمل ہے اور احساسی نقوش دراصل اشیاء فی الخارج احساسی مہیّجات ہیں۔ ادراکی عمل چونکہ اختیاری عمل ہے، اس لئے وہ پیشتر ہی سے ہماری دلچسپیوں اور رجحانات کے مطابق ہمیں اس امر پر آمادہ رکھتا ہے کہ ہم کون سے گذرے ہوئے احساسی نقوش کو اپنے شعوری ظرف کی آماجگاہ بنائیں اور کون سے اساسی تجربات کو نظر انداز کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ہمیشہ ان ہی محسوسات کی طرف متوجّہ ہوتے ہیں جن کے ساتھ ہماری زندگی کی دلچسپیاں وابستہ ہوتی ہیں۔

ہمارا یہ ادراکی عمل اگر اپنے وظیفہ سے کوتاہی برتے تو یہی نہیں کہ وہ ضروری اور غیر ضروری

یا مفید اور غیر مفید محسوسات میں ایک خلطِ مبحث پیدا کردے گا بلکہ وہ احساسات کو ہی سرے سے ہمارے شعور تک نہیں پہنچائے گا۔ اور ہمیں کسی امر کے متعلق بھی علم نہ ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تحصیلِ علم میں قوائے حسیّہ کے احساسات کے محفوظ کرنے کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ ہر روشن دماغ انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس ادراکی عمل کے دائرہ اور ان احساسی نقوش سے بہمہ وجوہ باخبر رہے یہ نقوش ہی دراصل علم کے خزانے کی کنجیاں ہیں۔ ایک اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ کی تصنیف میں جو فرق ہوتا ہے وہ فی الحقیقت احساسات کے محفوظ کئے ہوئے خزانوں کی نمائش اور ان کے اظہار پر ہوتا ہے جن میں سے ایک میں نہایت گہرے انداز کے ساتھ مصنف اپنے احساسات پر غور و خوض کرتا معلوم ہوتا ہے اور دوسری میں ان کی طرف سے لاپرواہی برتی ہوئی نظر آتی ہے۔ "جادۂ نو" پہلی نوع کی تصنیفات کی ایک زندہ و مستقل مثال ہے۔

اس اختراعی ادب سے سب سے پہلے میں ۱۹۳۲ء میں روشناس ہوا۔ اس وقت یا تو میں نے ان حسین اشعار کو ایک کیف و سپردگی کے عالم میں سنا تھا یا آج پانچ ساڑھے پانچ برس کے بعد ان کو فرضاً بڑے غور و خوض سے پڑھ رہا ہوں کیونکہ اس وقت میں لطف اندوزی کے لئے آزاد تھا لیکن اب ایک فرض کی ادائگی کے لئے مقید ہوں۔ اس وقت میرے کان صرف اکتسابِ کیف کر رہے تھے اب میری نظریں محض حقیقت کی متلاشی ہیں تاکہ میں دنیا کے سامنے اس نوعِ ادب کی اصلیت پیش کر سکوں۔

ان قطعہ بند اشعار کی ساخت و تعمیر میں جس دقتِ نظر کو کام میں لایا گیا ہے اس کے تجزیہ سے بیشتر میں اتنا کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی تمام تر بنیاد کہنے والے کے صرف اس جذبہ مستقلہ پر قائم ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے سماج سے کچھ چیزیں منتخب کر کے ان کا موازنہ یا ان کی تمثیل قدرت کے معاشرہ

کی متوازی اشیاء سے کرے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ معاشرت اور فطرت کے باہم دگر اتصال کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کرے۔ موضوع نیا بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ بہرکیف "جادۂ نو" میں میری نظروں نے جن جدید اور مخصوص چیزوں کو پایا ہے۔ میں ان کو ذیل کی سطور میں حتی الوسع اختصار و اجمال کے ساتھ بیان کروں گا اشعار اور اُن کی تلاش و تطبیق کا دلچسپ مگر خشک فریضہ میں قارئین کے لئے چھوڑتا ہوں۔

ان الفاظ کے بعد میں اصل گفتگو شروع کرتا ہوں۔

شعر کے متعلق ایک قدیم خیال ہے کہ شعر الفاظ کی اس مترنّم در و بست کا نام ہے جس کو سُن کر سامع کا خیال ہو کہ وہ خود بھی الفاظ کو اس طرح ترتیب دے سکتا ہے مگر جب ترتیب دینے کی کوشش کرے تو ناکام رہے۔ "جادۂ نو" اس اجمال کی تفصیل ہے۔ اس کا ہر بند پڑھ کر قاری کا ذہن یقیناً اس طرف رجوع ہوگا کہ وہ خود ایسی کاوش کر سکتا ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جس پختگیِ تخیّل، جس گہری توجہ اور دلچسپی کی اس قسم کے اشعار پیش کرنے میں ضرورت ہے وہ اس سے قطعاً مفقود ہیں۔

کسی مقصد کی ناتمامی کے لئے ہمارا شعوری اِنتشار ہماری کل جسمانی اور ذہنی قوّتوں کو دبائے رکھتا ہے اور معطّل کر دیتا ہے اگر ہم اس قسم کے منتشر تخیّل سے حتّی الامکان محترز رہ کر اپنی توجہ اور دلچسپی کو یکسو کر لینے کا عادی بنا لیں تو ہمارے کُل شعوری رجحانات ایک ہی مقصد یا ایک ہی منتہائے نظر کی تکمیل میں مرکوز ہو سکتے ہیں۔ اس وقت اس سے برعکس خیالات ہمارے شعوری ظرف میں قطعاً داخل نہیں ہوتے؛ اور اس طرح ہمیں اس امر کی تکمیل کا اعتقادِ کلی ہو جاتا ہے۔ یہ اعتقاد جب اپنی نشو و نما کے لحاظ سے پوری تکمیل کو پہنچ جائے تو اس اعتقاد سے مطابقت و موافقت کرتے ہوئے خیالات کی

اُملائی تحریکات تحت الشعور سے شعور میں، اس سے مناسبت رکھنے والے خیالات کو شدید طور پر لوٹانے کی طرف راغب ہو جاتی ہیں۔ قطع نظر اُن جسمانی حرکات کے جو خیالات کی اس رَو کے زیرِ اثر ہم سے صادر ہوتی ہیں خود خیالات ایک مستقل وجود قائم کر کے شاعر وادیب کے الفاظ بن جاتے ہیں۔ جو چیز ابھی تک اپنی اور ذہنی تھی وہ پرائی اور ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان ہی قسم کے خیالات نے "جادۂ نو" کی صورت اختیار کر کے آپ تک پہنچنے کی کوشش کی۔

اُن احساسی نقوش و تجربات کو جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے شعور میں داخل کرانے کے اعتبار سے تحت الشعور ہمیشہ توجہ کے تحت میں ہوتا ہے خواہ توجہ کا عمل ارادہ یا دلچسپی کے زیرِ اثر ہو یا اعتماد کے ماتحت تو گویا ان احساسی نقوش کی تخلیق و ترتیب اور تنظیم و تفصیل توجہ کے زیرِ اثر عمل میں آتی رہتی ہے اس لحاظ کر جن زیرِ نظر قسم کی تصانیف میں ان احساسی نقوش کی پوری دیانت داری سے حفاظت کا پتہ چلتا ہو ان کو دیکھتے وقت ہمارا اوّلین فرض یہ ہونا چاہئے کہ ہم مصنف کی توجہ کی یکسوئی اس کے اعتقاد کے استحکام، اس کے ارادہ کے استقلال، اس کے ضمیر کے انبساط اور اس کی دلچسپی کے نفوذ کی تلاش اس تصنیف میں کریں۔

"جادۂ نو" میں ایک خاص قسم کی توجہ کی یکسوئی کا پتہ چلتا ہے اگر ہم بغور دیکھیں تو اس نتیجے پر پہنچینگے کہ ہم میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنھیں یہ معلوم ہی نہیں کہ عام طور سے ہمارا شعور ہمارے ضابطے میں نہیں ہوتا۔ حالانکہ ہمیں شعور کو اس صورت سے قابو میں رکھنا چاہئے کہ جس مسئلے کے متعلقہ امور میں جس مدت تک ہم اسے قائم رکھنا چاہیں قائم رکھ سکیں۔ اگر ہم میں یکسوئی اور ارادہ کی یک جہتی کا یہ مادہ نہیں ہے

تو ہماری "جادۂ نو" کی قسم کی کوشش کبھی بار آور ثابت نہیں ہو سکتی لیکن اگر یہ چیز ہم میں پوری نشوو نما حاصل کئے ہوئے ہے تو وہ کوشش دنیائے ادب میں مشعلِ راہ کی حیثیت اختیار کر لے گی۔ ہم اکثر ٹہلتے ہیں اور اس وقت بالعموم خالی الذہن ہوتے ہیں لیکن اگر اس وقت کوئی خیال ہمارے دماغ میں آبھی جاتا ہے، تو ہم کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ یہ خیال کیوں، کس طرح، کس ذریعے سے اور کس شکل میں ہمارے ذہن میں آیا اور یہی ثبوت انتشارِ تخیل کا ہے۔

شاعر ہی نہیں، بلکہ اس شاعر کے لئے جس کے ذہن میں ایک مخصوص تخیل رچا ہوا اور جو ایک مخصوص مقصد کے ماتحت ان صداہائے بازگشت کا منتظر ہو جو فطرت اور معاشرت کے اتصال کی گونجیں پیدا کر رہی ہیں اگر مقصدِ حیات نہیں تو کم از کم فریضہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی توجہ کو اسی مخصوص اور محدود مقصد کی تکمیل میں مشغول رکھے۔ اور اسے ہرگز ہرگز آزادی کے ساتھ اِدھر اُدھر منتشر ہونے کیلئے نہ چھوڑے اس کو چاہیے کہ بجائے توجہ کو حاکم بنا دینے کے اس کو ہمیشہ محکوم رکھے۔ "جادۂ نو" اس فرض کی تکمیل کا مکمل ثبوت کہاں تک ہے اس کے ملاحظہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔

اس توجہ کی یکسوئی کو ایک مثال سے سمجھاتا ہوں۔ شاعر ایک بند کمرے میں بیٹھا ہے۔ غروبِ آفتاب کا وقت ہے۔ ڈوبتے سورج کی زرد کرنیں کمرے کے روشندانوں سے گزر کر دیواروں پر پڑ رہی ہیں۔ کمرہ بند ہونے کی وجہ سے کھلی فضا اور اس بند کمرے کی روشنی میں ایک بیّن فرق ہے۔ "بجھتا سا نور" اس کے احساسی نقوش کو ابھار رہا ہے اور توجہ کی یکسوئی اس منظر اور اس احساسی نقوش سے متعلق خیال کا انتزاع اس کے ذہن میں کراتی ہے۔ یہاں عمل توجہ کی پختگی اور مشاہدہ کے عبور کی وجہ سے یہ نہیں ہوتا

کہ توجہ اس کو کسی غلط راستے پر پڑ جائے بلکہ وہ اُس وقت کے جذبات کو اس طرح عالمِ وجود میں لاتی ہے ؏

عمر سے دامن چھڑا لیتا ہے جب دورِ شباب — زندگی کو اس طرح پاتی ہے اک طبعِ غیور
جیسے روشندان کے شیشوں سے ہنگامِ غروب — بند کمرے میں در و دیوار پر بجھتا سا نور

یہاں صرف "بجھتا سا نور" تھا جس نے توجہ سے واصل ہو کر بیار نادر مصارع کا لازوال وجود قائم کرا دیا اور قاری ان کو پڑھنے کے بعد خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ "جادۂ نو" میں جگہ جگہ ایک خاص نفسیاتی نکتہ کی توضیح کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر انسان خیال کرتے وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے یا جو منظر اس کے دل و دماغ پر کوئی اثر ڈال رہا ہے اُس سے اُس کے کسی خاص مقصد کا تعلق بھی ہے یا نہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی اور شعور کو لاابالی طریقہ پر خیال کرنے کے لئے آزاد کر دیا جاتا تو ناممکن تھا کہ "بجھتا سا نور" کوئی اثر قائم کر کے اس جذبہ کی طرف لے جاتا جس سے متاثر ہو کر یوں کہا جا سکتا کہ ؏

عمر سے دامن چھڑا لیتا ہے جب دورِ شباب

دورِ شباب کے ختم ہو جانے کے خیال اور بجھتے سے نور کے وجود میں جو ایک مخصوص ہم آہنگی پیدا کر دی گئی ہے اس سے توجہ کی یکسوئی کا احساس بخوبی ہو سکتا ہے۔

یہ چیز یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس سے کچھ قدم آگے بڑھیئے تو ایک اور عقدہ کھلتا ہے۔ قاعدہ ہے کہ ایک انسان کسی ایک وقت میں، کسی ایک امر کے متعلق، کامل طریقہ پر یک جہتی کے ساتھ خیال کر سکتا ہے، لیکن اس کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ اس کی دلچسپی اس امر کی نسبت مکمل طریقہ پر کارپرداز ہو گئی ہو۔ اس

حالت میں اس کا شعور اس درجہ کی انجذابیت اور اس بلا کا انہماک حاصل کر لیتا ہے کہ وہ بجز متعلقہ امور کے شکل ہی سے کسی دوسری قسم کے امور کی طرف رخ کرتا ہے لیکن شاعر کے تخیل کا ہر پہلو انجذابی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ احسانؔ، راقم الحروف اور چند دیگر احباب چہل قدمی کر کے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں شب دُلھن کی تیز و مستانہ خوشبو تمام فضا کو معطر کیے ہوئے تھی۔ بحث، تمحیص، ہنسی مذاق، جملے بازی، تفریح سب ہی کچھ ہو رہا تھا۔ ہر شخص کا ذہن زیادہ سے زیادہ اس خوشبو سے حظ اندوز ہونے کی طرف رجوع تھا اس سے زیادہ نہ کسی شخص میں توجہ کی یکسوئی تھی نہ کوئی خاص مقصد اور نہ ہی کوئی انجذاب و انہماک۔ لیکن ان تمام جملے بازیوں، بذلہ سنجیوں اور ان عنایتوں کے باوجود جن سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ احسانؔ ہماری ہی طرف رجوع ہیں اور جن میں وہ بھی برابر کے شریک تھے فرمانے لگے ؎

یہ سنہری شام یہ عثمانیہ[1] کا لالہ زار، جا رہا ہوں بےخود و مسرور ہم پہلوئے دوست
آ رہی ہے یوں عروس اللیل کی گہری شمیم گرمیوں میں جیسے ملے پیرہن سے بوئے دوست

اس صحیح اور خود تجربہ میں آئے ہوئے واقعہ کی تفصیل سنانے کے بعد اگر آپ مجھ سے اس بند کی تحلیل کی بھی امید کریں تو یہ آپ کی سراسر زیادتی ہوگی مجھے اس وقت اس لمحہ کی یاد اور اس بند سے کیف اندوزی میں زیادہ لطف حاصل ہو رہا ہے۔

یہاں تک آپ نے خیالات کی وہ مکمل درجہ کی یکجہتی جو "جادۂ نو" کے مخصوص موضوع کی نسبت انتہائی عقیدت کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہے۔ پھر اس مخصوص موضوع سے شعوری خیالات کی موافقت، جس کو

[1] مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا ایک ہاسٹل۔ راحت

ماہرینِ نفسیات "اعتقاد" کہتے ہیں اور اس موافقت سے بچے" اور صحیح اعتقاد کا جو "جادہ نو" کی تخلیق و ترتیب کا باعث ہوا (جس کو میں نے سطور بالا میں کہیں "ضمیر کے انبساط" سے تعبیر کیا ہے) کچھ اندازہ فرمالیا آیئے اب آپ کو کچھ اور آگے لے چلوں۔

میں نے اوپر کی سطور میں دو ایک جگہ دلچسپی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ دلچسپی دراصل ذہن کے اُس رجحان کو کہتے ہیں جس کے ذریعے ایک انسان کسی امر کی طرف بہ رغبتِ تمام مشغول ہو جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دلچسپی پیدا کس طرح ہو؟ میں اس سوال کے جواب میں شاید کچھ زیادہ جگہ لے لوں کیونکہ "جادۂ نو" کا اس جواب سے یہی نہیں کہ کوئی مخصوص تعلق ہے بلکہ میرے نزدیک یہی چیز "جادۂ نو" کی جان بھی ہے۔

دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ہمیں نہایت گہرے اور پر زور مشاہدہ کا عادی ہونا چاہیئے۔ ہم کسی امر کی طرف ہر وقت غور کریں، اس کی نسبت ہمارے علم میں خود بخود اضافہ ہوتا رہے گا اسی طرح ہم کسی چیز کو بغور دیکھیں تو اس کے بعد منظریہ تخیل سے اس کی ایک خیالی عمارت بنا کر اُس کے ہر خلا کو اپنے مشاہدہ کے ذریعہ پُر کر کے اپنی قوتِ حافظہ کی مدد سے عالمِ وجود میں لا سکیں گے۔ ہمارا منظریہ تخیل جس قدر تربیت یافتہ اور خارجی پیغامات کو قبول کر کے اس کی ضمنی حفاظت کرنے والا ہوگا اسی نسبت سے ہم کسی دیکھی ہوئی چیز کے اجزا سے کماحقہٗ واقف ہونگے۔ اس نکتہ کو زیادہ اچھی طرح وہ قارئین سمجھ سکتے ہیں جو خوش قسمتی یا بد قسمتی سے قانون پیشہ بھی ہوں کیونکہ ایک اسی پیشے میں مشاہدہ اور مطالعہ دونوں کی ہر ہر قدم پر ضرورت ہوا کرتی ہے۔ وکیل کے پاس ایک مقدمہ آتا ہے۔ وقتی طور پر وہ

تمام حالات سن کر موکل کو مشورہ دے دیتا ہے لیکن بعد کو جُوں جُوں وہ اس قانونی مسئلہ پر غور اور اپنے وسیع مشاہدہ کے خزانوں سے اس مسئلے کی کڑیاں ملانے کی کوشش کرتا ہے اسی قدر اس کے کمزور اور مضبوط پہلو نمایاں سے نمایاں تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور ایسے دیانت و تندہی سے کام کرنے والے کے مخالف کیلئے یہ امر دُشوار مُشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اس سے بازی لے جا سکے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو میں نہیں چاہتا کہ اس عضوِ معطل انسان کی کامیاب یا ناکام زندگی پر یہاں کوئی فیصلہ دوں یہ اصول ہر جگہ جاری ہے صرف دلچسپی، غور و خوض اور مشاہدہ ہی غیر معمولی ذہانت کے مظہر ہو سکتے ہیں۔ شعر و شاعری کی تمام تر تصنیفات کے معمولی اور غیر معمولی ہونے کا جو فرق ہے وہ مصنف کے صرف مشاہدہ کرنے ہی کی مناسبت اور مطابقت پر مبنی ہے۔ حضرت جگر مراد آبادی کے شعر کا ایک مصرعہ ہے ؎

خیالِ یار سے بھی کچھ شگفتگی نہ ہوئی

اور یہ عالم اُس وقت کا ہے جب عاشق کے دل پر "افسردگی" طاری ہے۔ میں ہمیشہ اس چیز کو خلافِ فہم سمجھتا رہا اور جب کبھی مجھ سے اس مصرعہ پر فیصلہ لیا گیا میں نے بے باکانہ اسے مہمل قرار دے دیا۔ میں نے کبھی ایسی افسردگی کا منظر دیکھا تھا اور نہ ہی میرے تجربہ میں آیا تھا۔ جب خیالِ یار بھی عاشق کو شگفتہ نہ کر سکے میرے نزدیک یہ مصرعہ پستیٔ ذوق اور قنوطیت کا ثبوت تھا لیکن ایک مشاہدہ نے مجھے اپنے فیصلوں پر نظرِ ثانی کیلئے مجبور کر دیا اور آج میں اس خیال کا اسی طرح قائل ہوں جس طرح اس کے اثر و جذبہ کے ماتحت کسی خاص مشاہدہ کی تفصیلات کے مدِ نظر جگر نے یہ مصرعہ کہا تھا۔

"جادۂ نو" کا مخصوص موضوع جتنا بذاتہٖ جاذبِ توجہ ہے اتنا دلچسپ نہیں۔ ہم کو ضرور اس میں ایک

نوع کا کیف حاصل ہوتا ہے لیکن ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اس کی یکسانیت و یگانگت کی تلاش میں کہنے والے کو کن کن مشکلات کا سامنا ہوا ہوگا۔ اور باوجود ان تمام موانع و مراحل کے ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ کہنے والا از اوّل تا آخر اس "کوششِ رنگین" (یہ ترکیب احسان ہی کی وضع کی ہوئی ہے) میں مشغول ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ کوئی امر بذاتِ خود دلچسپ نہیں ہوتا بلکہ اس کے واسطے مفہوم میں دلچسپ و غیر دلچسپ ہونے کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ دلچسپی ہمارے ذہن کا ایک خاص طرزِ عمل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہمارے شعور میں تطبیق کی ایک کافی وسعت موجود ہوتی ہے۔ "جادۂ نو" کے مطالعہ سے یہ امر بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ ہر بند بذاتہٖ مکمل ہونے کے علاوہ ایک خاص مشاہدہ اور ایک خاص خیال کا حامل ہے اور یہی نئی اور بدلتی ہوئی حالتیں ہیں جن کی وجہ سے ایک طرف قاری کو بغایت دلچسپی مسحور کئے رہتی ہے اور دوسری طرف مصنف بھی اپنی دلچسپی میں انتشار پیدا نہیں ہونے دیتا۔

دلچسپی اور مشاہدہ ہی وہ میدان ہیں جہاں انسانی عقل اور ذاتی ذہنی ارتقاء کی جلوہ طرازیاں نظر آسکتی ہیں۔ ہم دو طرح باتیں سیکھتے ہیں۔ ایک سن کر، یا کسی کتاب میں پڑھ کر اور دوسری بذاتِ خود۔ اگر ہم بغور دونوں کا مقابلہ کریں تو ہم کو دونوں حاصل کی ہوئی باتوں کا فرق بڑی آسانی سے نظر آسکتا ہے۔ دوسرا علم قدرتاً پہلے علم سے زیادہ مکمل اور بہتر ہوگا۔ کیونکہ دوسرے علم پر ہم کو ذاتی کاوشِ حصول کی وجہ سے جو اعتماد اور بھروسہ ہوگا وہ پہلے علم پر نہیں ہوگا۔ دوسرے علم کے متعلق ہماری واقفیت نہ صرف حقیقت و صداقت پر مبنی ہوتی ہے بلکہ ہم کو عام طبقہ سے نکل جانے اور خاص طبقے میں بھی نمایاں ہو جانے میں مدد دیتی ہے۔ لیکن ہمارا ذاتی طور پر کسی چیز کا علم حاصل کرنے کا ذریعہ بھی کسی خاص اصول و

قاعدہ کے ماتحت ہے۔ زندگی میں کوئی کام ایسا نہیں ہے جو کسی منضبط اصول پر نہ چل رہا ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اُس اصُول سے واقف نہ ہوں۔

کسی چیز کا ذاتی طور پر علم حاصل کرنے کے لئے ہم کو چاہئے کہ ہم اُس شے کی تفصیلات مدِ نظر رکھیں اگر ہم اپنے مشاہدات میں تفصیلات کو نظر انداز کر دینگے تو یہ ہی نہیں کہ اس چیز کے متعلق ہمارا علم ادھورا اور ناقص ہوگا بلکہ اس شے کے متعلق ہم جو کچھ بھی کہیں گے اس میں بجائے یقین و اعتماد کے تذبذب و شک و شبہ ہوگا۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ ہمارے مشاہدے میں جو کچھ آتا ہے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں جتنا دیکھنا چاہیئے وہ دیکھ لیا اور جس قدر سننا چاہیئے وہ سُن لیا۔ یہ ہی خیال ہے جو ہمیں کسی چیز کی تہ تک نہیں پہنچنے دیتا اور ہمارا علم نامکمّل اور سطحی رہ جاتا ہے۔ قطعِ نظر عام شاعری کے جس میں ذاتی احساسات و تجربات کو ایک اساسی حیثیت حاصل ہے "جادۂ نو" کا جو موضوع ہے اس میں اسی مشاہدہ کی ضرورت ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کہنے والے کے قوائے حسیہ بہترین طریقہ پر تربیت یافتہ ہیں اور وہ ان سے اس سے زیادہ دیکھ اور سُن سکتا ہے جتنا کہ ایک معمولی انسان دیکھتا اور سنتا ہے۔ اس قدر گہرا مشاہدہ، وسعتِ نظر، پختگیٔ تخیّل اور بیدارئ مغز پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ "جادۂ نو" میں ان تینوں کا ایک حسین امتزاج نظر آئے گا۔

جب آپ میرے ساتھ چل ہی رہے ہیں تو پہلے ان کی مثالیں سن لیجیے۔

وُسعتِ نظر ؎

بن گئے زینے گلابی بدلیوں کے سوئے شرق ۔۔۔ پڑ رہی ہے ہلکی ہلکی دھوپ میں دھیمی پھوار

جس طرح دو زم دلِ بچھڑے ہوئے احباب کی ۔۔۔ سامنے آتے ہی ہنستے وقت چشمِ اشکبار

دیگرہ ۰ چاند سے کچھ دور اک تارا چمکتا ہے مدام — دونوں اپنے اپنے مرکز سے گزر پاتے نہیں
جس طرح دو طالب و مطلوب ناراضی کے بعد — تنہا تنہا راہ میں چلتے ہیں اور ملتے نہیں

پختگیٔ تخیل ۰ ہے اگر تو مرد دامانِ صداقت کو نہ چھوڑ — توڑ سکتی ہی نہیں دنیا ترا سازِ اُمید
راستی کے روبرو ہر ساز ہو جاتا ہے گنگ — جس طرح استاد کے غصے سے شاگردِ رشید

معیارِ مشاہدہ ۰ لیگئے وہ ساتھ ساری زندگی کی رونقیں — گھر کا یہ عالم ہے ان کے روٹھ کر جانے کے بعد
جس طرح دیہات کے اسٹیشنوں پر دن ڈھلے — اک سکوتِ مضمحل گاڑی گزر جانے کے بعد

بیداریٔ مغز اور صحت مندیٔ دماغ کی مثال میں پورا "جادۂ نو" پیش کیا جاسکتا ہے۔

اس شخص کی ذہنی علو پردازی اور حافظہ کی عدیم المثال تقویت کا حال شاید میں بیان نہ کرسکوں جو اس سے زیادہ دیکھ اور سن سکے جتنا کہ عام طور پر اسے دیکھنا اور سننا چاہیے۔ اگر آپ اس پر اصرار کریں تو برکلے کے ان الفاظ کو نقل کرنے کے بعد کہ "تمام محسوسات کو محض اپنے ہی نفس کے متعلق تکیفات و حوادث قرار دینا وہ حقیقت ہے جو ذہن سے اس قدر قریب اور اتنی بدیہی ہے کہ اسے دیکھنے کے لئے آدمی کو صرف اپنی آنکھیں کھولنے کی ضرورت ہے" اتنا اور عرض کرونگا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کے پیش نظر "جادۂ نو" کا مطالعہ کیجئے آپ شاید خود کسی اچھے نتیجہ پر پہنچ جائینگے۔

دنیا کا ہر بڑے سے بڑا کام چند چھوٹے چھوٹے کاموں کے نتائج کا مجموعہ اور سخت سے سخت پیچیدہ اور محیر العقول مسئلہ کچھ مختلف حصوں پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے مشاہدہ کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ ہم جس چیز کا مشاہدہ کرنا چاہیں اس کے ہر حصہ سے بالتشریح اور بالوضاحت واقف ہونے کی کوشش کریں

اور جب تک اس کے کسی ایک حصہ کی نسبت مکمل و مفصل تلاش و جستجو نہ کر چکیں اس وقت تک دوسرے حصہ کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ ورنہ ممکن ہے کہ اس چیز کی کُنہ و حقیقت سے واقف ہونے سے پیشتر اس قسم کی دشواریاں اور زحمتیں پیدا ہو جائیں جن کے اثر سے پھر ہماری طبیعت اس طرف رجوع ہی نہ ہو اور وہ مشاہدہ ادھورا اور غیر مکمل رہ جائے۔ مشاہدات میں نکتہ رسی کی اہلیت ہماری دلچسپیوں کو قائم رکھنے اور اس شے سے بخوبی واقف ہونے بڑی ممد ثابت ہوتی ہے۔ بڑی بڑی تصنیفات کو دیکھنے سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ہمیں اپنے مشاہدے میں توجہ اور دلچسپی کو قائم رکھنے کی کس قدر ضرورت ہے اور ان کو قائم رکھ کر ہم اپنی تصنیفات کا درجہ کتنا بلند کر سکتے ہیں۔

میں نے سطور بالا میں کہیں تصنیفات کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہونے کا معیار احساسی نقوش کے تحفظ کو قرار دیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم بالعموم اشیاء کے عام اثرات تو قبول کر لیتے ہیں مگر ان کی تفصیلات نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عام انسان کبھی کوئی عمدہ تشبیہ پیش نہیں کر سکتا اس لئے قریب قریب ناممکن ہے کہ وہ ایک موجود واقعہ کی تطبیق کبھی کسی نازک اور عمدہ گذرے ہوئے منظر یا واقعے پر کر سکے۔ اس کے پاس وہ دارالضرب ہی نہیں جہاں تشبیہ کے سکّے ڈھالے جاتے ہیں۔ اُس کا ذہن اس امر کی کوشش تو ضرور کرتا ہے اور اکثر کوئی تشبیہ یا کوئی کنایہ نکال بھی لیتا ہے لیکن اول تو غیر متعلق اور دوسرے بودی اور کمزور۔ اس کے برخلاف ایک وہ شخص ہے جس کی ذہنی تربیت میں نقوشِ احساس کی حفاظت بادجوہ اکمل ہو چکی ہے جس وقت کسی شے کے احساسات کی رَو اُس کے شعور تک رسائی کرتی ہے اور اُس کے شعور کو اس کا علم ہوتا ہے وہ کبھی خاموشی سے

اُسے قبول نہیں کرتا بلکہ اس سے کسی نہ کسی قسم کا نتیجہ یا مطلب نکالنے کی طرف مشغول ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ وہ ایک سُرخ پھول دیکھتا ہے پھول کی احساسی تصویر فوراً ہی اس کے شعور میں قائم ہو جاتی ہے لیکن اس کا شعور اِس احساسی تصویر کو بطور احساسی تصویر کے قبول نہیں کرتا وہ اس احساسی تصویر کے ساتھ کسی اسی جیسے پھول کی احساسی تصویر کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جو پہلے اس کے مشاہدے میں آ چکی ہے۔ اس طرح ذہن میں ایک مخصوص عمل کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اور ہر وقت قائم رہتا ہے۔ شعور کا یہ ردِ عمل ہمیشہ نادر تشبیہات کی تخلیق کا باعث ہوا کرتا ہے۔ "جادۂ نو" میں یہ چیز بہت نمایاں ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ نادر تشبیہات ہی کا ایک منظوم مجموعہ ہے اِس میں جس قسم کے احساسی نقوش یا دنیاوی اُمور کی طرف توجّہ کی گئی ہے وہ نہایت کاملانہ عبور، حاویانہ قدرت اور مکمل طریقے پر کی گئی ہے۔

میرے اِس دعویٰ کا ثبوت چاہیے، سُنئیے!

آسماں پر ہیں خراماں ابر پاروں کے ہجوم
اس طرح کھُل کھُل کے چھپتی ہے جبینِ آفتاب

جس طرح ہمسایوں کی آمد سے ہنگامِ سحر،
گھر میں شرمیلی نئی دلہن کا اندازِ نقاب

دلچسپی اور مشاہدہ کی اس تفصیل کے بعد ایک اور نتیجہ پر نظریں پہنچتی ہیں۔ جب ہم کسی مسئلے کی تفصیلات سے بہ اکمل و تمام واقفیت حاصل کر لیتے ہیں اور ہمارا تحت الشعور معلومات سے لبریز ہو جاتا ہے تو ہم اس مسئلے کو مجموعی طور پر وسعت دینی شروع کرتے ہیں۔ اس وقت تفصیلات کے یہ کل خزانے ہمارے سامنے بجائے ایک خواب کے ایک نہایت مکمل شکل میں جلوہ گر ہونے لگتے ہیں اور ہم "جادۂ نو"

جیسی چیزیں تخلیق کر سکتے ہیں۔ یہاں ایک اور احساسی چیز ہماری دَر پردہ مدد کرتی رہتی ہے جس کو زبان نفسیات میں "تخیلِ ایجادی" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دُنیا کی ہر وہ شئے، جس کی انسان کے ہاتھوں سے نمود ہوتی ہے، محض شعوری تخیل کا نتیجہ ہے۔ ہم ایک شئے بھی ایسی نہیں بنا سکتے جس کا ذہنی مثنیٰ اس کے وجود میں آنے سے قبل موجد یا ترتیب کنندہ کے ذہن میں قائم نہ ہوا ہو۔ دراصل تخیلِ ایجادی ہر شعبہ زندگی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ مادہ کبھی متحرک نہیں ہوتا۔ یہ ہمارا ایجادی تخیل ہی ہے جو اس کو جو چاہے شکل دے دیتا اور دے سکتا ہے۔ بڑے بڑے مصنفین ہمیشہ اپنے اس تخیل ہی کے ذریعہ الفاظ سے کھیلا کرتے ہیں۔ ان کا تخیل الفاظ کا پابند نہیں ہوتا بلکہ الفاظ اُس کی پیروی کرتے ہیں۔

ہر شخص میں خیال کرنے کی قوّت موجود ہوتی ہے لیکن بعض ایسی مخصوص ہستیاں بھی ہیں جن کے شعوری خیالات بے انتہا جذبی قوّتوں سے معمور ہوتے ہیں۔ ہم میں سے چند ہی اس نکتہ سے واقف ہوتے ہیں کہ جس قدر وقت ہم کو کسی ناکامی کے ظہور میں لانے کیلئے ضائع کرنا پڑتا ہے اتنا ہی وقت ہم کسی کامیابی کی تکمیل میں بھی صرف کر سکتے ہیں۔ ہمارے شعور کی ترکیب لحظہ بہ لحظہ خیالات سے قائم ہوتی ہے۔ ہم میں یہ بھی قدرت موجود نہیں ہے کہ ہم اپنی کل تحریکات کو جو بیرونی احساسی نقوش کے باعث ہمارے شعور میں ایک تلاطم برپا کئے رہتی ہیں الفاظ میں تبدیل کر سکیں اور نہ ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے کل سابقہ تجربات کی تحریکات کو، جو ہمارے شعور پر ہر وقت اثر انداز ہوتی رہتی ہیں کوئی لفظی جامہ پہنا سکیں۔ یہ کام قدرت چند منتخب نفوس کے ذمہ کرتی ہے اور یہ ان

ہی کی خواہش، دلچسپی اور توجہ کی یکجہتی ہوتی ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کون سے احساسی نقوش اور خیالات کو الفاظ کا جامہ پہن کر ہمارے سامنے آنا چاہیئے اور کون سے نقوش کو تحت الشعور کے لامحدود خزانوں میں روپوش رہنا چاہیئے۔ وہ انسان جو اپنے خیالات کو توجہ کے ذریعہ سے ضابطے میں رکھ کر اُس شے کی جس کے متعلق وہ خیال کرتے ہیں ویسی ہی ذہنی تصویر کھینچ سکتے ہیں جیسی کہ وہ چاہتے ہیں پھر ان کے لیئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہوتا کہ وہ مناسب الفاظ میں ان تصاویر کو ہمارے سامنے پیش کردیں۔ متواتر توجہ کی یکسوئی' یا خیالات کی یکجہتی کے باعث' ان کا شعور اعتماد استحکام حاصل کرلیتا ہے۔ تحت الشعور اس اثر کے ماتحت ان کے شعور میں وہ ہی خیالات موجزن کرتا ہے جو ان کے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان ہی کی جذبی تحریکات کی مناسبت میں' حسین اور اثرانگیز الفاظ، اس شئے کو ذہنی وجود سے مادی وجود میں جلوہ گر کرادیتے ہیں۔ زیرِ نظر تصنیف کے ہر نبد کا یہ ہی حال ہے۔

"جادۂ نو" نے ہمارے گرد جو منور ماحول قائم کردیا ہے اس کی روشنی میں قوانین آتلاف کے ماتحت ہمارے سابقہ اور "جادۂ نو" کے پیش کردہ مشاہدات میں ایک طرح کی کشمکش محسوس ہونے لگتی ہے۔ ہم سوچنے لگتے ہیں کہ کہنے والے نے یہ کیوں کہا کہ ؎

ٹال میں تو قیر کی تو، گو پڑا ہے خاک پر ۔۔۔ سینکڑوں من روز جس کانٹے پہ تُل جاتا تھا
ہو نہ ہو اک دن یونہی اہلِ دل کے ظلم سے ۔۔۔ ٹوٹ جائیگا دلِ مزدور کا صبر و قرار

آخر ہماری نظر سے یہ مشاہدہ گذرا ہوگا مگر ہم نے کبھی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جو کہنے والا نکال رہا ہے،

ہمارے پیش نظر بھی مزدور کی مجبوری اور اس کے آئندہ خطرناک نتائج ہو سکتے ہیں۔ مگر ہم نے یہ غور کبھی نہیں کیا کہ صبر و قرار بھی کسی روز اسی طرح ٹوٹ سکتا ہے جس طرح یہ ہر روز منوں بوجھ اٹھانے والی ٹنگ ٹوٹی پڑی ہے۔ آخر ہماری توجہ اِدھر کیوں نہیں پہنچی۔ اس کشمکش سے یہ نہیں ہوتا کہ ایسے معمولی معمولی واقعات سے اس قدر غیر معمولی اسباق حاصل کرنے والی ہستی سے ہم گریزپائی اختیار کرنے لگیں بلکہ ہمارے اندر خود ایک مخصوص دلچسپی اور مخصوص تجسّس کی لہر دوڑ جاتی ہے ہم جلدی جلدی آگے بڑھے جاتے ہیں اور جیسے جیسے کوئی امر مُشترح اور واضح ہوتا چلا جاتا ہے ہماری دلچسپیاں اس کی طرف نہایت شدّت سے بڑھتی چلی جاتی ہیں اور جس قدر بھی ہماری دلچسپیاں اس طرف زیادہ ہوتی جاتی ہیں ہم اس مسئلے سے مُناسبت اور مُوافقت کرنے والے خیالات میں مُنہمک ہوتے چلے جاتے ہیں اور جس قدر زیادہ ہمیں اپنے موافقت کرنے والے خیالات میں اِنہماک ہوتا ہے اسی نسبت سے ان خیالات کی جذبی قوّتیں باہمدِگر مُتحدّ ہو کر ایک مرکز پر آجاتی ہیں اور اس طرح وہ خیال جس سے ہم چند لمحات پہلے برسرِ پیکار تھے حقیقت میں بدل جاتا ہے۔ اور ہم دَم بخُود رہ جاتے ہیں۔

اس سے آگے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ "جادۂ نو" کے فنّی، لسانی، تعمیری، شعری اور دیگر ضروری پہلو خود اس قدر نمایاں ہیں کہ ان کے متعلق کچھ کہنا وقت ضائع کرنا ہے۔ اور ان چیزوں کے متعلق کہنا اور کہے جانا بھی ایک رسم پارینہ سی ہو گئی ہے جس سے جہاں تک ہو سکے اِحتراز ہی بہتر ہے۔

میں یہ ضرور کہونگا کہ شاعری کے نشاۃ جدید کے احسان دانش جیسے بلند پایہ فرزند کی اس اختراعی و تخلیقی کاوش کے متعلق جس کی تو اردِ ذہنی نے اس قدر ہمت بندھائی ہے' اتنا کچھ کہہ دینے کے بعد بھی وہ سب نہ کہہ سکا جو کہنا چاہتا تھا اور اس کی ایک سے زیادہ وجوہات ہیں۔ جو آپ کو خواہ مخواہ کیوں بتاؤں؟ فقط

راحت کدہ۔ مراد آباد

سیّد راحت مولائی
ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی
آنریری ایڈیٹر "جوہر" مراد آباد

جیسے شبِ تنہا تپیدہ میں دل کا سماں
پیدا ہے سکوں پائی ہیں عکس جن کے
جیسے آئینے دل میں زباں پہ آئی ہے
منعکس ہوتی ہے آکر عظمتِ پروردگار

تھا گھٹاؤ گھٹاری کا جبینِ کہکشاں پہ
ہے گونداری زخم کے طلعت سے نمایاں
ہے سینۂ شاعر بھی اسی طرح کہ اس میں
ہے زخم رنگینیٔ اشعار کا نمایاں

دان سے گزشتہ صدی پانی سے آگے کیا نیز دور سے کو

کہ سکتی کار تیلوں کو حیثیت پیش بنی ہے لگا منتہ

وصوبی پیکی سلسلہ ریاست جعلی کلیں گلیاں ریت

بعد میں آ لا امریکہ میں جیسے بچا پہ ملکا ضمیر

عمر سے دامن چھڑا لیا ہے جب دوستوں نے

زندگی کو اس طرح پایا ہے کہ اس سے بخ عیو

جیسے وقت سنداں سے تیشوں سے ہنگامِ غرور

بند کر دیں در و دیوار پہ کھیت سا نور

دو لفظ زیر لب کہ جنگل کو لرزش ہے سکوت

اک کشتِ ناتواں کی چمن آرائی ہے چھپتی

جیسے کہ دوشیزۂ مصور پہ سردیاں تاہیں

شرمیلی عنبر دلبر انساں کی نظر

یہ اندھیری رات یہ جوشِ بہارِ بے بصر
پھر بھی ہے شیملے پہ طاری عالمِ خوابِ گراں
پتّھروں کی سرد سانسوں سے فضا معمور ہے
ٹہنیاں سجدے میں ہیں رُوکے ہوئے انگڑائیاں
ہیں بلند و پست پر ہنستے ہوئے برقی نجوم
پڑ رہا ہو جس طرح پانی میں عکسِ آسماں

چاند سے کچھ دور اک تارا چمکتا ہے مدام

دونوں اپنے اپنے مرکز سے الگ ہٹتے نہیں

جس طرح دو طالب و مطلوب ناراضی کے بعد

تنہا تنہا راہ میں چلتے ہیں اور ملتے نہیں

شام اور راستے میں پتوں کی گرد اور سے غبار
جھلملیں میں ذرہ ذرہ آنکھ جھپکتا ہوا
جنگلوں میں منتظر خاموش پیپل چھپائے ہوئے
جیسے کوئی ٹھہر گیا ہو راہ میں گاتا ہوا

میرے احساس پہ اک سحر سا کر دیتا ہے
جو سماں ریل سے کہسار کا آتا ہے نظر
وہ مچلتے ہوئے بادل وہ دھواں دھار فضا
وہ ہواؤں کی خنک سانس اِدھر اور اُدھر
جیسے برسات کے پُرکیف دنوں میں احساں
تھرتھراتی ہوئی کشتی کی سمندر میں سحر

دوپہر کا وقت، گھٹا ابر آلود کی، سنسان بن
ہو گئے ٹھٹھک سے ہر اک ذرّے پہ سی طاری ہے ملال
جس طرح دیہات میں جب ہو وبا پھیلی ہوئی
ہوتا ہے بیمار کو عمرِ گذشتہ کا خیال

بھورے بھورے بادلوں سے آسماں لبریز ہے

اس طرح ضو بانٹتی ہے ہر دریچہ ماہ پر نیم وا ہے

جیسے ساحل کی فصیلوں سے لپٹ جاتی ہیں

سرخ پانی میں حسیں مچھلی کا [illegible]

یہ دھوپ کیا مستی کی تپش ہے برق شرر ریز

ٹھٹکتی پھرتی ہے بہکتے ہوئے ذرات

مزدور ہے مصروف سنبھالے ہیں کسے پیٹ

جس طرح سموتی ہیں پریشان خیالات

جب کسی کی یاد آ کے تلملا جاتا ہے دل
جگمگا اٹھتا ہے کچھ اس شان سے میرا دماغ
جیسے ساون کی برستی رات میں کوئی نازنیں
صحن میں زینے کی آئے ہاتھ میں لے کر چراغ

زلزلہ آیا اور گزر بھی گیا
ہے سکتہ شہر میں ابھی اب تک
جیسے شیشوں سے طیقوت
پگڈنڈی کی جنبش سے اول

چاندنی میں ایک پیکر نور ہے اور پگھلا ہے
ننگے پیڑ ہیں یا نوری پریاں کھڑی ہیں
جس طرح سنتے ہیں کہ محبوب یہاں بستی ہے
چھپتے سے نکل کے جھرکے کوئی نازنین حسین ہے

چشمۂ شاہی[۱] پہ وقتِ دوپہر آیا ہوں میں
صحن پر ہے سایہ زن گویا ہے در و دیوار سی
خامشی نغموں میں سناٹوں سے ہم آغوش ہے
مٹ گئی ہو جیسے خودداری کسی خوددار کی

۱؎ چشمہ شاہی کشمیر میں ایک مشہور اور قابلِ دید مقام ہے۔

دہلی کا اک رئیس بہ ہنگام جانکنی
سر دھن رہا تھا چارہ گروں میں گھرا ہوا
جیسے فسوں گروں کے جھمیلے میں نیم شب
کھیلے سیاہ ناگ کا تازہ ڈسا ہوا

پرکھا ہے مقدر جب مصائب کی کسوٹی پر
تو یہ تجربہ از قریب معلوم ہوتا ہے
وطن سے دور اپنے جلیسِ اجنبی ماحول بن جاتا ہے
کہیں سورج نکلتا ہے کہیں معلوم ہوتا ہے

بیٹھے بیٹھے جب الٹ جاتی ہے ماضی کی نقاب
دیکھتی ہے یہ سماں تخئیل کی بالغ نگاہ
جیسے تھوڑی دیر ننھی بوندیاں پڑنے کے بعد
چرخ پر خالی سمٹتے پھیلتے ابرِ سیاہ

صبح نشاطِ شام جو ہجراں لاکھوں برس ہے

انہیں ستاروں کی آس میں یہ دوری ہے فراق

پھوٹی وہ نئی صبح ہیں کہ نکستاں ستاں نہیں

بھیگی کہاں ہو جہاں ظلمتِ عصیاں میں برق

بگولوں میں جیسے قدموں پہ سورج
شفق سے سرخ ہے دنیا کا سینہ
عجب شے ہے پتیاں سی شبنم
سیکھا ہے دل میں جیسے سینا

تھا اس معلی کی نقعی پیش کاردان الا یا نہیں

آگیا ہے اس لیے ایگنیٹیس[له] کے کھرے ٹپہ زبان

یعنی جب انسان کو دولت ملتا ہے مسکون

روح سے معدوم ہو جاتا ہے مطلق ادب و زباں

له ایک سائیس کا نام ہے جو کبھی میرے قریب رہتا تھا۔

مجبوری کا اور اس میں ارمان خیالات
اک تجلی سی ہے نگاہوں میں
دل پہ ایسا سماں مسلط ہے
چاندنی جیسے خانقاہوں میں

تم کہ عکسِ رخِ بالائے شفق پائی ہیں

نسیمِ سحر کے تبسم عمرِ مغنی صبحیں مسکرائی ہیں

یا بالِ جبریل پہ ہیں دو بادہ ہوا ہے جنچ تیرتی ہیں

مصحفِ قرآں کی کتابیں ثنا کی تنزیلیں پارہ آئی ہیں

سحر وقت جب شبنم بن کے پاؤں چھوتا ہوں
تو اکثر اس طرح خوش قلب پر ارمان ہوتا ہے
پیالی میں جیسے دو شعلوں کی نہر سے کا
سینے کی پیالی میں لرزنے سے اک طغیان ہوتا ہے

حوضِ سحر میں گر پڑا گلاب کا پھول
پانی لے کے دور چلا ہے
جیسے بستی بستی نے وادی کا
ہر مشکل سے پار اترا ہے

ریل گاڑی جانبِ شملہ ہے سرگرمِ سفر
گونج سے ہی درہم و برہم خموشی کا نظام
پٹریوں میں دلنشیں جھنکار ہے جھونکوں میں لو
بنتی جاتی ہے دھوئیں سے اک کمانِ تیرہ فام
یوں دھوئیں میں کھڑکھڑاہٹ سی گرجتی ہے نہنگ
جیسے اک بیدرد کے دل میں خروشِ انتقام

میں جب دن بھر کے ہنگامے کو دہراتا ہوں فرصت میں
تو ہر اک سانس پیغامِ ندامت لے کے آتی ہے
ارادہ نیکیوں کا جس طرح عہدِ جوانی میں
محبت جب ریا کی چوٹ کھا کر بیٹھ جاتی ہے

ستارہ پوچھ کے کیا کھینچ گیا نقشِ حیراں
طائر کا علالت میں مجھے چھوڑ کے جانا
جس طرح سے شہزادی نقلِ مکاں پر
فاقے میں اچانک سے کسی مہمان کا آنا

۱۵۔ توقیر طاہر

میں ہوں اور کوہِ سلیماں کی بہت اونچی چٹان
خوف سا طاری ہے نیچے دیکھنے سے رُوح پر
یہ سماں کچھ اس طرح محسوس ہوتا ہے مجھے
مل رہی ہو زندگی سے موت کی جیسے نظر

باغ میں جھومتی ہوئی وقت سحر
نرم جھونکوں سے لہلہاتی ہے
جیسے آنکھوں نے لال کر کے
ہاں نگاہوں سے مسکراتی ہے

جب کوئی دنیا نے نفرت سے محبت کا جواب

اس طرح احساس کے مطلع پہ کھنچا ہے سحاب

دن ڈھلے جیسے کسی چھوٹی سی بستی پہ سرک آتی ہیں

زرد و بے کیف سے پٹی پہ چلی ریل گاڑی کا دھواں

احسان جو کل تھے لبِ آغوش کی زینت

وہ آج جلاتے ہیں نہیں بجھتے بلا ہیں

ویران ہیں بکھرے ہوئے نظروں سے قلب و تصور

جیسے کہ ستاروں کا عنواں ہیں اُجڑی ہوئی دنیا ہیں

ٹال میں توقیر کے ہوتا پیدا اس سے نکلی آتش

سینکڑوں من وزن جب نکلے تو پہنچ جاتا تھا بار

ہو بہو اس کے دن لعوتی ایک دو دل سے نکلے

دعوے ٹالے گا دل پر زور دو کا صبر و قرار

۱؎ توقیر طاہر میرا عزیز دوست اور پنجاب کول کمپنی کا مالک۔

پیڑ ہوا اور پھیل کی پابندی سے آزاد

کیسا پیچک آیا تھا ہے مری آنکھوں میں یاد

جب جب سوچا تو آنسو کے لعل کے مجبور ضبط

بوسہ جھلکے کہ رہ جائے لبوں کے متصل

مفلسی اور اس میں گھر پر بن بیاہی بیٹیوں کا ہجوم

سب پہ پھیکا سا تبسم دل میں اندوہ شدید

رخ پہ پیدا ہیں اس طرح افسردگی کی تیوریں

جس طرح پردیس میں بیکار پردیسی کی عید

ہوا کے ریشمیں بازو دوش پر کھلے گیسوئے شب رنگ کارواں ہیں
نسیم مستانہ رقص میں ہے فضا پہ نشہ سا چھا رہا ہے
بنات آئی ہیں سنگ لیکے بہار آستیں میں دولت لیے ہوئے ہیں
کہ جیسے کوئی حسین نہا کے گھنیری زلفیں سکھا رہی ہے

ہے اگر تو مردِ دانا ان صداقت کو نہ چھوڑ

دوستی کی راہ میں دنیا تری اسرار ہیں

راستی سے روبرو ہر راز ہو جاتا ہے سنگ

جب جہاں استاد کے غوطے سے پتا کر دیا

شمعِ تاریکی ہے مغرب کی طرف چھائی ہوئی
کیسا ہنگامہ بپا ہے گردوں زمیں سے پوچھ سوال
ڈوبتے سورج سے سُرخی پر ہے وہ مایوسی کا رنگ
جیسے ایک بیمار قوی ہو دو نزع کے بعد انتقال

جا رہی تھی ریل سوئے لکھنؤ کل رات کو
چاندنی برسا رہا تھا چودھویں کا ماہتاب
میں نے جب دیکھا دریچے سے بیاباں کی طرف
آ رہا تھا اس طرح گاڑی کا سایہ ہمرکاب
جس طرح پیری میں نم آلود سجدوں کے عوض
چشمِ الطاف و کرم کے ساتھ ہی خوفِ عذاب

پھرتا ہے پیچھے پیچھے میں کس کے شعور اکھڑا اکھڑا ہوا

دانہ پانی کی طرف دیکھے نہ بازو پھیرے پھیرے

جیسے احساس زیاں راہ وفاداری کے بعد

وقت بیتے نہ کسی محبوب کا اپنا پایا

لہ ایک چھوٹا سا پرندہ

پہنچی شام ہے عثمانیہ کا لالہ زار
جا بجا ہوں بیخود و سرمست ہم پیالے دوست
آ رہی ہے بوئے عروس لئیس آ گئی گھڑی تبسم
گیسوؤں میں جیسے سلیمان سے لعب دوست

ـہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کا ایک ہاسٹل۔

غم دوراں پہ تو قدر رہتا ہے ماضی کا اثر
شادمانی میں بھی اکثر مسکرا سکتے نہیں
جس طرح دو دوست یکسر دوری کے باوجود
مدتوں کے دور رہ کر دل سے جا سکتے نہیں

گدا ہوں مجھ کو لیکن دولت کونین حاصل ہے
وہ آئینہ ہوں سر تھا یہ ایسی بھی کہاں میری
ہیں ان کو دیکھ کر احسان یہ میں سہتا ہوں
سر دریں پل کی دی ہے مجھ کو عمر رائیگاں میری

مفلسی کے وقت اگر عشرتِ رفتہ کی یاد
یوں دکھاتی ہے جھلک آئینۂ ادراک پر

دوپہر میں جس طرح دریا سے میداں کی طرف
چلتے پھرتے ابر کے ٹکڑوں کا سایہ خاک پر

سینہ میں گھٹ ٹھہر گیا ہے چھپ گئے ابرِ سیاہ

پنہاں ہے ملنے کی سی کسک میں پیاسی تنہائیاں

جیسے یادِ وطن میں ہے ذوقِ سوزِ جی کی وقت

ویرانے میں نئی ویدی کے اشکوں کا سماں

ترینہ دور سے میں انھیں دیکھ رہا ہوں

آنکھیں تعویذ ہیں مسرور ہیں تبسّم دل ہیں خورسند

جیسے کسی شاعرِ ناشاد و حزیں ہیں

نتھیں غزل آزاد تبسّم جو ہیولا بن

بن گئے رنگِ گلاب کی پتیوں لبوں کے سوتے نشتر
پڑ رہی ہے ہلکی ہلکی دھوپ بھی ہیں دھیمی پھوار
جیسے دور مرادان بکھرے ہوئے احباب کی
سامنے آتی ہے بیتے وقت جیسے چشمِ اشکبار

دیکھیں کی دو دھوپ سے کئی میں کا جنون از دو درپیش

سرنگوں ہے نظارۂ حسن آئے کسی میں پہ فروزندہ گام

جیسے نوعمری میں جب جب احساس سے کھلتی ہے گرہ

شہر ہے جبر و بے انصاف آقا کا غلام

اس طرح آتے ہیں انجانے محبت کے خیال
عشق والوں میں دل کو سنبھالے ہوئے دیتے ہوئے
جیسے کھیتوں سے کنارا دل پہ اترے صبح کو دھوپ
جیسے چھاؤں کے سائے کہیں سرد ہیں لیتے ہوئے

یاس میں بیداریٔ احساس کا عالم نہ پوچھ
ٹھیس سی لگتی ہے دل پر طعنۂ بہار سے
جس طرح سردی کی افسردہ اندھیری رات میں
نیند اچٹ جائے کسی بیمار کی آواز سے

بستی کی دنیا ایسی معلوم ہوتی ہے مری[1] کی کہ بد نقش جمود بیاں ہے

جھکی ہے تیغ جو تشنا ابر سے آنکھیا میں بد سایہ کی چھائی ہیں

رہا ہے فطرت بلا ہوا ہے صبا کسی شعر اک رنگ لے

مجھے محسوس ہوا ہے کہ اک اردو میں کہہ آئی ہیں

[1] کوہ مری سے مراد ہے۔

وہ مری رات کی عجیب خاموشی
لرزشیں دل سے آ گئی ہیں
جب کچھ دیر سے گزرنے سے
بزنہ سانس ہیں سے سنیں

شمع روشن ہیں کہ دل ہیں قطار اندر قطار

کیوں نہ ہو شعلہ نما تیرہ شبستاں ضیا ان سے تو اک

یہ سماں پیدا ہے جس طرح ہے جلووں میں جن

اُن کا ہونا یوں ہے پیدا جیسے پلکوں پہ اشک

ٹ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا ایک ہاسٹل

رات ہوئی برسات ہوئی مسجد میں روشن کر کے چراغ

پیڑی ہاتھ سے روشنی پھیکی ہوئی دیواریں

جیسے آئی یاد کے آنسو ڈوبے سورج کی جوت

تھم گئی ہو آنکھ میں جیسے ساری رات

جب کوئی جگنو چمکتا ہے اندھیری رات میں
اس طرح ظلمت میں لہراتی ہے نورانی لکیر
جیسے ناداری میں اکثر دوشیزوں کی جبیں
جاگ جاگ اٹھتا ہے اکثر خوددار انساں کا ضمیر

رو دیا ہے کہ اپنی ماں کی گود میں کسی شیرخوار
اس طرح پلکوں پہ آنسو ہو رہے ہیں بے قرار
جیسے دیوالی کی شب ہلکی ہوا کے سامنے
گاؤں کی نیچی منڈیروں پر چراغوں کی قطار

گلیاں جیسی رات تاریکی
اک دریا دوڑتا ہے
جیسے اک پرخلوص انساں کا
مشکلوں میں خیال آتا ہے

شام ہے کہ نور ستاروں میں آبادی کے دور

جا رہا ہے ایک پیاسا لہروں میں بستا ہوا

جیسے کسی مزدور مزدوری سے اکتائے ہوئے

مشکوں کی داستاں لکھی ہے سسکتا ہوا

دم بخود ہیں شام کے آثار سے بانسوں کے جھنڈ
چرخ کی غمگین صورت سے برستا ہے ملال
ہچکیاں لیتے ہیں ذرّے سسکیاں بھرتا ہے دشت
سست ہے نبضِ ہوا کیلے کے پتّے ہیں نڈھال
اس طرح ہے ہو بہو یہ ماتمستانِ خموش
جیسے اک آلودۂ عصیاں کو عقبیٰ کا خیال

شام کے زرپاش جلووں میں سیاہی آگئی
چھا گئی ظلمت سی جنگل پر اندھیرے کی سپاہ
جیسے اک دوشیزۂ دیہات کا سانولا بدن
تیرے سینے سے لپٹا ہو اک ناگن سیاہ

آسماں پہ ہیں درخشاں ابر پاروں کے ہجوم

اس طرح سے کھل کے چھپی ہے جبیں سے نقاب

جیسے ایوان سے کسی کی آمد ہنگام سحر

تھی کھسکتی نئی دلہن کا ازار نقاب

ہمنشیں یاس کے دھندلکے میں
رحمتِ حق کا جب خیال آیا
مسکرائیں نحیف اُمیدیں
روئے ایماں پہ نور لہرایا
جیسے بھادوں میں سبزہ زاروں پر
ہو کہیں دھوپ اور کہیں سایا

لے گئی وہ ساتھ ساری زندگی کی رونقیں
گھر کا یہ عالم ہے ان کے روٹھ کر جانے کے بعد
جیسے دیہات کے اسٹیشنوں پر دن ڈھلے
اک سکوت مضمحل گاڑی گزر جانے کے بعد

دل نے سیکھی جہانبانی شعور و دانش چلے گئے
چھا گیا ایسا نشاطِ روح پر ابرِ ملال
جیسے احساس سے عید پہ سے بیخ سوختہ وقت
دیں کی محبوب نہ ہوا گیسوؤں کا خیال

چھو کر اس بت کی پیشانی کو کرتا ہے پیدا

اس طرح آئی نظر جیسے آب میں تصویر کا عکس

جس طرح عصیاں شعار دل کو سیہ کاری کے بعد

سمجھی ثابت ہوا کرتی ہے تعمیر عکس

جس طرح سے کہ سرِ طاق سے زلفیں ہے ملول
ہم نشینوں پہ الگ ہو کے کوئی آشنا ہوتا نہیں
یہودی جب کہ خودغرض انسان آشنا کسی کا ہو
اہلِ زمانہ کے سوا کوئی اُسے روتا نہیں

۱؎ شمس الرحیم۔ زلفی

بارشِ دوستی میں جھلکتے ہیں
دھندلے دھندلے نقوشِ خیابانی
جیسے گرمی میں صبح کے ہنگام
آسماں کی بیکراں اُداسی

تیشیوں سے جھنڈ سی گلنار ایک ابھرا ابھی

جا لیے ہے اس طرح بانجھ سی کی ٹہنی پائمال

جیسے معمولی سے اس کی شب کو فروزاں نہر

شوکی سی کھیوں میں ہیولے زود رنگاری کی ڈھال

لہ پُرانے درختوں پر دو ایک ٹہنیاں ان درختوں کی نوعیت سے علیحدہ عموماً پائی جاتی ہیں جن کے پتے شاداب اور ر‌ولدار ہوتے ہیں جو بکریوں کی من بھاتی غذا ہے۔

مٹی کی دو بیتی ہیں پیڈ رُوپتی ہوا اور اُس سے

چمن کی ہار ہیں جس گل کی سمجھتا پھرتا ہے

سوکھی مجھی جس طرح نہیں زعفر ہیں پیتی ہیں

وفعتہ ہاں بیچ شہید ہوا کے مسکراتا ہے

جهانک بر باشدن باشه سماسی لرزاندی کیفیتی سرتزاو قاب

آتشکده‌لری کاوه‌نک یاسون کلاه جمجمه‌لردن بیرق

ایلچ ماللرته تاریخک یکی دوران کناردو تستری

نفسی بر یاییه صیحه مستقبل ایله الیساندن انکالر ظلم

سکوں کی جستجو انساں کی فطرت میں ہے لیکن
حقیقت میں اطمیناں جو پایا ہے تیرا ہے
کوئی شے سی فضا میں جیسے رشتہ جوڑ لیتی ہو
یقیں جیسے یقینی کی منازل سے گزرتا ہے

دکھایا حسنینؔ[1] نے گملا جو لا کر دھوپ میں

بیلوں کے پھولوں کی زرد و ریشے ہیں گرمی کا اثر

جیسے کوئی بےوفا باوفا کے سامنے

سر تمھاری کر کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

[1] محمد حسنین جونپوری

پُجاری کیا پوجتے ہیں صبحدم خورشیدِ خاور کو
مگر جب ڈوبتا ہے کوئی بھی پرساں نہیں ہوتا
نظر اٹھتی ہے اہلِ دید کی ہر عالم کی جوانی پر
سوئے پیری کی ہیں لیکن حال کا پرساں نہیں ہوتا

کھیتیوں سے سرمئی سائے کی ردا کھینچے ہوئے

ایک بادل اس طرح گذرا افق تا دوش پر

جیسے اک منظر فن دو تشنہ ہو جانے کے بعد

راہ میں مخلص عزیزوں سے چھڑا ہے زیست نے

یہ سکوتِ شام یہ ٹھنڈی ہوا یہ سبزہ زار

یہ پیڑ کے سوکھے پتّے اُڑتی ہوئی آموار سے نفاک

یہ پیاس کچھ اس طرح معطّر ہوا ہے مجھ

جس طرح بزمِ طرب میں آکے دلِ اندوہناک

ناامیدی کے دھوئیں میں جیسے گھر جاتا ہے عشق
یوں نظر آتی ہے سوزِ حسرتِ ارماں کی لو
چاندنی میں تتلیاں سی ہیں افق پہ شمع سے جس طرح
لے صبا آنچل بستی کی فضا سے خواب

ٹوٹتا ہے ناگہاں جب کوئی پیمانِ وفا
ایسا غم محسوس کرتا ہے دلِ احساس کیش
جیسے سمِ زہرِ اسود لبوں سے چھین لے کوئی نشاط
چٹکیاں سی دل میں کلیاں آرزو کی آنکھوں میں سمٹ

ایک جوہڑ کے پاس گاؤں سے دور
ہے فضا میں غم آفریں تاثیر
سیکڑوں گدھ اور ایک بیل کی لاش
کس قدر ہے گھناؤنی تصویر
جیسے اک خانقاہ کے آگے
زائروں پر جھپٹ رہے ہوں فقیر

نامرادی میں جب آجاتا ہے، عشق کا خیال
اس طرح اٹھتا ہے عمر راحت کا دامن تھامنے
جیسے وہ بیگانہ جس سے رہ چکا ہو ربط و ضبط
دیر وائے لوٹ آجاتا ہے ماضی سامنے

عمل کی قوتیں سو گئیں معطل ہیں بنی نوعِ انساں ہیں

اضافہ ہو رہا ہے لیکن اخلاقی کتب ابواب کا

پڑی جب عمر ڈھلنے سے قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں

ضعیفی دُہرا رہی ہے افسانہ شباب کا

چمن کا دورِ ناسازی ابھی تک بھی نہیں سازگار

پشیماں ہے بہت بے فصلِ گل گزر جانے کے بعد

دیکھتے ہیں جا بجا سب بادِ پھولوں کا زوال

جیسے محبوب نظروں سے اتر جانے کے بعد

پہاڑوں کی تمنا ہیں یا خود رو درخت

پچھتاووں کی تخیل ہیں بے ترتیب سائے

جیسے اک نمود ساز ازل امر و امر کے باوجود

زندگی ہیں کہ جس کے دل ہی دل میں سمائے

رخِ خورشید پہ ہیں زرد بادل

نہیں اب زر فشاں گزرے دنوں کا سہرا

لدی ہے عالمِ بیکراں پہ نئے سے احسان

اُتر جاتا ہے اک مفلس کا چہرہ

مرا اقبال سے شاید تعلق اتفاقی تھا
وگرنہ شخص جب بیدار ہو تو قصہ سو جاتا ہے
یہ جو اب دوستی کا اس نے ازدواج سے ملتا جلتا ہے
جو دل سے لب تک آتے آتے وقت ہو جاتا ہے

تازہ تازہ دوستی میں اختلافِ طبع سے

اس طرح ہوتا ہے دل پر نا امیدی کا اثر

جیسے ریگِ نقش پر دھوپ کی بارش کے بعد

دیکھیے ہم وہ صورت کہ جو دیکھی نہیں

کوہ ہندوکش کے ویراں دامنوں پر پسری ریت

کارواں آکے جابجا ہے مضمحل و بیزار سے

جس طرح پا بالیسیوں ہیں اِک سا بھی نہیں

منتقتی کی آرزو ترکی ہے دلِ نادار سے

جس طرح وقتِ اذاں سے پیشتر کسی روزہ دار

ڈالتا رہتا ہے گردوں سے تشنہ نظر سے

یونہی اک ناشاد عمر سے وعدۂ محبوب سے

کان آہٹ پہ لگائے ہے ترے ہیں آنکھیں راہ پر

جارہا ہوں لو پیٹھے دریا کی سمت
خطّہ خطّہ چاندنی سے مضمحل
ٹھیکرے سرودوں پہ سیادہ ماہتاب
ہو بہو جس طرح نشیب کا دل

جب سب روٹھ کر تنہا نہیں کوئی اپنا نہیں
سہہ نہیں سکتی لطف و پیچیوں کا اتنی تاب
جیسے شب بھر جاگتی ہے سوتی دن بھر کے لیے
ہو اپنے سر پہ اُٹھائے رتجگوں کی بیداری کا عذاب

آتے ہیں بیاباں سے جھونکوں میں مسلسل زیر و بم

پڑ رہی ہے وہ درختوں پہ سیاہی کی جھپاں

جیسے عین اس وقت جب آنکھوں میں گھل جاتی ہے نیند

بات کی آواز آتی ہے کہ اب جسم و جاں

ریل گاڑی میں کبھی کرتا ہوں جب لمبا سفر
لاکھ کوشش کیجیے دل تقویت پاتا نہیں
جس طرح بھادوں میں شدت کے بخار آنے کے بعد
پہلے پہلے کچھ دنوں جم کر چلا جاتا نہیں

گرمیوں کی تپش میں کسی جھونکا ہوائے سرد کا

گیا طاری وہ عالم تشنہ دہانے کے بعد

جیسے کسی انجمن جو ہو جاتی ہے وقتِ گفتگو

منتشر آرزو باتیں دل سے محو ہو جانے کے بعد

بڑ[1] کے سائے میں چاندنی کا سماں،
پتیوں میں ہیں نور کے پیوند،
جیسے ساکن ندی کی حیرتیاں،
ہو زیادہ طلوعِ نور سے سند

[1] برگد کا درخت

دکھاتا ہے شمع دنیا کو لالے سے کبھی نے
اک چیز ہے جہاں کا سیہ پیش منارہ
پیدا عکس سے یوں دنیا کا ہے جیسے
اترا ہو آسماں سے کوئی دمدار ستارہ

پیں ہر کہیں پہ دور ہیکل نشیمن سے دور دیئے جت
سانولی خامشیوں میں چھپ رہا ہے آفتاب
جا رہا ہے اک سپیرا بین والا گا کر اس طرح
جیسے ہو رات بھر جاگی ہوئی آنکھوں میں خواب

چراغاں

یہ احسان دانش کی نظموں اور غزلوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ مسلمہ ہے کہ احسان جو محسوس کرتا ہے وہی کہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُس کی شاعری کا مبہم سے مبہم اشارہ اور ہلکی سے ہلکی آواز سامعین کے رگ و ریشہ میں تیر جاتی ہے۔

احسان کے دِل و دماغ کی کاوشوں کا نتیجہ نادار طبقہ کی ترجمانی اور مناظرِ قدرت کی عکاسی ہے۔ وہ اپنی کامیابی کا انحصار ہوائی اور ہنگامی داد و تحسین پر نہیں سمجھتا بلکہ سامعین کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ دیکھ کر تسکین پاتا ہے۔ غزلوں میں بھی اُسکی نزاکتِ احساس اور اخلاقی دیانت برقرار رہتی ہے۔ اس کتاب میں ہر جگہ احسان کی شاعری کی جملہ خصوصیات نمایاں ہیں۔

قیمت عمہ مجلّد عا

مکتبۂ دانش مزنگ لاہور

آتشِ خاموش

یہ کتاب ہندوستان کے مزدور شاعر احسان دانش کی شعلہ آفریں نظموں اور جنوں نواز غزلوں کا مجموعہ ہے۔ شاعر نے فاقہ کشی کے الم پرور مناظر محنت اور سرمایہ داری کے خونچکاں مرقعے، پامال انسانیت کے درد انگیز خاکے اور دولتمندی کے بیدار کن مظالم اس خلوص اور دیانت سے پیش کئے ہیں کہ ہر نظم خوابیدہ غیرت کو بیدار کر دیتی ہے۔ آتشِ خاموش کے ہر شعر پر ناتواں سے ناتواں انسان کا خون جوش کھانے لگتا ہے اور کمزور سے کمزور ہستی آزادی کی جد و جہد کے لئے بیتاب ہو جاتی ہے۔

قیمت عہ۔ مجلد عمہ

مکتبۂ دانش مزنگ لاہور